مذہب اور قانون کا باہمی رشتہ

(سر الفریڈ ڈیننگ)

[یہ مضمون سر الفریڈ ڈیننگ (SIR ALFRED DENNING) کی ایک تازہ ترین کتاب "بدلتا ہوا قانون" (THE CHAGING LAW) کے آخری باب کا ترجمہ ہے۔ کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا ہے اس کے مصنف ملکۂ برطانیہ کی کورٹ آف اپیل کے ایک جج ہیں۔ یہ مضمون ہمارے تعلیم یافتہ طبقے خصوصاً ہمارے قانونساز اور قانون دان حضرات کے لیے قابل مطالعہ ہے اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب کے مذہبی مبلغین اور اخلاقی مصلحین و مفکرین ہی نہیں، بلکہ وہاں کے بعض مقننین بھی اس حقیقت کو کھلے دل سے تسلیم کر رہے ہیں کہ مذہب کو بنیاد بنائے بغیر کوئی دستوری، قانونی یا اجتماعی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ اس مضمون سے اس امر کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اہلِ مغرب کے پاس جس صورت میں بھی اور جو کچھ بھی بچا کھچا اثاثہ مسیحیت کی تعلیمات کا موجود ہے، وہاں کے قانون دان کس طرح اسے اپنے سینوں سے چمٹا کر قانون سازی کے کام میں اس کو اپنے لیے مشعل راہ بنانے کی جد و جہد کر رہے ہیں۔ ایک طرف یورپ کے یہ قانون دان ہیں جو بڑی تشویش کے ساتھ اس بات کو محسوس کر رہے ہیں کہ ان کی حیاتِ اجتماعی سے اگر مذہب کی کارفرمائی غائب ہو گئی اور قوانین کی مذہبی بنیادوں کو منہدم کر دیا گیا، تو کوئی قانونی نظام بھی کامیابی سے نہیں چل سکے گا۔ دوسری طرف ہمارے قانون ساز ہیں جنھیں ہر اسی تجویز پر پریشانی اور ناگواری محسوس ہونے لگتی ہے جس میں اسلام کو دستور اور قانون کا ماخذ اور بنیاد قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا ہو]۔

عہدِ قدیم میں مذہب اور قانون کا تعلق بہت ہی گہرا تھا مگر جدید زمانے میں مذہب کا قانون پر کوئی نمایاں اثر باقی نہیں رہا ہے۔ گزشتہ ادوار میں مذہب، اخلاق اور قانون اجزائے لاینفک کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً تورات کے احکام عشرہ میں سے پہلا حکم "مذہبی" نوعیت رکھتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں: "خدا نے فرمایا کہ میں خداوند تیرا خدا ہوں، تیرا کوئی الٰہ نہیں ہے سوائے میرے"۔ پانچواں حکم اخلاقی نوعیت کا ہے جس کے

الفاظ یہ ہیں: "اپنے والدین کی عزت کر تاکہ تیرا قیام اُس زمین میں دراز ہو جو تجھے خدا عطا کرے۔" آٹھواں حکم ایک قانونی فریضہ ہے اور اس کی عبارت یہ ہے: "تو ہرگز چوری نہ کر۔" قدیم مذاہب و اقوام سب میں یہی صورت حال تھی۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ مذہب، اخلاق اور قانون تینوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا۔ اس تفریق و امتیاز کو اب بہت دُور تک پہنچا دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بہت سے لوگوں میں اب یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مذہب اور قانون کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ان لوگوں کا مقولہ یہ ہے کہ "مذہب خدا اور انسان کے تعلقات متعین کرتا ہے اور قانون ایک انسان اور دوسرے انسان کے تعلقات کا تعین کرتا ہے۔" اسی طرح ان لوگوں کا کہنا یہ بھی ہے کہ قانون کا اخلاق سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ قانون بہر حال واجب الاتباع ہے خواہ وہ اخلاقی لحاظ سے صحیح ہو یا غلط۔ قانون کا مقصد معاشرے میں نظم و ضبط کو برقرار رکھنا ہے نہ کہ عدل و انصاف کو قائم کرنا۔

میری دانست میں تفریق و انقطاع کا یہ تصور حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ اگرچہ مذہب اور قانون کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے، تاہم یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں بہت بڑی حد تک ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ مذہب کے بغیر اخلاق کا وجود ناممکن ہے اور اخلاق کے بغیر قانون کا وجود محال ہے۔ آیئے میں آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کروں کہ ہمارے قانون کے بنیادی اصول کس طرح عیسائیت کی تعلیمات سے اخذ کیے گئے ہیں۔

صداقت

سب سے پہلے ہم حق و صداقت کے اصول کو لیتے ہیں۔ میرے خیال میں کوئی انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہمیشہ سچ بولنا ہر آدمی کا بنیادی فریضہ ہے۔ اب اگر مذہب، اخلاق اور قانون کے تقاضوں سے قطع نظر کر کے محض مصلحتِ وقت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حق پرستی کے خلاف بھی اتنے ہی دلائل دیئے جا سکتے ہیں، جتنے اس کے حق میں دیئے جا سکتے ہیں۔ انگریزی میں ایک ضرب المثل ہے کہ "دیانت و صداقت بہترین پالیسی ہے۔" لیکن ایک مصلحت بین انسان کی نگاہ میں اس ضرب المثل پر کاربند ہونا دانشمندانہ نہیں، بلکہ سراسر ایک احمقانہ فعل قرار پائے گا۔ اگر جھوٹ بولنے سے اس کا مقصد حاصل ہو گا تو وہ ضرور جھوٹ بولے گا اور دلیل یہ دیگا کہ اصل اعتبار مقصد کا ہے نہ کہ ذریعے کا۔ مثلاً ایک مصلحت پرست انسان کے خلاف اگر یہ الزام عائد کیا جائے کہ وہ نشے کی حالت میں کار چلا رہا تھا تو وہ بڑی آسانی سے انکار

کر دیگا خواہ یہ الزام صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ جھوٹ سے ہمیں صرف اس لیے نفرت ہے کہ ہمیں اپنے والدین نے اس وقت سچ بولنے کی تعلیم دی تھی جبکہ اُن کی آغوشِ عاطفت میں ہمارے اندر بھلے اور بُرے کی تمیز پیدا ہو رہی تھی۔ ہمیں دینِ مسیحیت نے یہ سکھایا ہے کہ ہم ہمیشہ اور ہر حال میں سچ بولیں سینٹ پال نے فرمایا تھا "جھوٹ کو ترک کر کے ہر آدمی اپنے ہمسائے کے سامنے سچ بولے۔ کیونکہ ہم ایک ہی برادری کے افراد ہیں"۔ ہمارے اندر غصے اور ناراضگی کے جذبات سب سے زیادہ اُس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی گئی ہے ___ ہمارے سامنے دروغ گوئی سے کام لیا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر ہماری شخصیت کی کوئی توہین نہیں ہو سکتی۔ نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا آدمی ہمیں دھوکا دے اور نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم کسی دوسرے کو دھوکا دیں۔

مقدس فریب | بعض مذہبی خیال رکھنے والے لوگ خاص حالات میں نیک مقصد کے لیے جھوٹ بول لینے کو جائز سمجھتے ہیں۔ رومن کیتھولک چرچ ایک زمانے میں اسے جائز قرار دیتا تھا۔ مثلاً حضرت مسیح اور دوسرے صلحاء کی زندگیوں کے بارے میں افسانے گھڑ کر انہیں حقیقی واقعات کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس سے مقصود ایمان و اعتقاد کو پختہ کرنا تھا، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک فریب تھا۔ اسی کے نتیجے میں "مقدس فریب" (PIOUS FRAUD) کی اصطلاح وضع کی گئی جو اب ہماری زبان میں عام رائج ہو چکی ہے۔ موجودہ زمانے میں اس کی ایک مثال وہ دروغ مصلحت آمیز ہے جس کا ارتکاب ایک معالج اپنے مریض کے سامنے کرتا ہے۔ کیونکہ اُس کے نزدیک یہ فعل مریض کے حق میں نفع بخش ہوتا ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ "ہمسائے سے سچ بولنے" کا حکم قطعی اور مطلق ہے۔ سینٹ آگسٹائن کے نزدیک حق گوئی ایک قطعی فریضہ ہے جس میں کسی استثناء کی گنجائش نہیں ہے۔ انہوں نے اس کے حق میں صرف اس دلیل کو کافی سمجھا ہے کہ جھوٹ بولنے والے کو عالم آخرت میں حیاتِ طیبہ نصیب نہیں ہو سکتی۔ موجودہ دور میں کانٹ اور بعض دیگر مفکرین کا بھی یہی خیال ہے کہ ہر حالت میں سچ بولنا قطعی ضروری ہے۔ آپ یہاں یہ سوال کر سکتے ہیں کہ حالتِ جنگ میں کیا دشمن کو دھوکا دینے کے لیے جھوٹ بولا جا سکتا ہے؟ لیکن ایک سچا عیسائی اس کا بجا طور پر یہ جواب دے سکتا ہے کہ جو دشمن ہمیں تباہ و برباد کرنے کے درپے ہے

اُس پر "مسایہ" کا اطلاق نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اُس سے سچ کہنا ضروری ہے۔

قانون اور صداقت اب آپ قانون کو لیجیے قانون کی نگاہ میں بھی سچ بولنا نہایت ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک خالص سچائی منظرِ عام پر نہ آئے، قانون اور عدل کے تقاضے کبھی بھی پورے نہیں ہو سکتے۔ قانون اور عدل کی محافظت اور تنفیذ کا بہت بڑا ذریعہ ہمارا عدالتی نظام ہے لیکن اگر فریقین اور گواہ عدالتوں میں سچ بولنے سے گریز کریں تو انصاف کا خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے قیام کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوں گی۔ اس سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حق پرستی، جس کا اصل سرچشمہ مذہبی تعلیم ہے، قانون کے بقا کے لیے کس قدر ضروری ہے اور مذہب و قانون کا باہمی تعلق کتنا گہرا اور بنیادی ہے۔ یہاں میں جملۂ معترضہ کے طور پر اتنی بات ضرور کہوں گا کہ میرا یہ استدلال ایک مفروضے پر مبنی ہے اور یہ استدلال اُسی صورت میں صحیح ہو گا جبکہ قانون بذاتِ خود عادلانہ ہو اور عدالتوں میں بیٹھنے والے جج خود بھی حق و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہوں۔ اگر قانون ظالمانہ ہو گا یا عدلیہ کے علمبردار اس کے نفاذ و اجرا میں انصاف پسندی سے کام نہیں لیں گے تو عدالتوں میں پیش ہونے والے گواہوں کے اندر لازماً یہ رجحان پیدا ہو گا کہ وہ "مقدس فریب" سے کام لے کر دروغ بیانی کریں۔ ہمارے ہاں ایک زمانہ وہ تھا کہ چالیس شلنگ قیمت کی چوری کی سزا موت تھی۔ اس کا نتیجہ ایک مرتبہ یہ نکلا تھا کہ پانچ پونڈ کے ایک مسروقہ نوٹ کے بارے میں جیوری نے پوری سنجیدگی سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس نوٹ کی قدر و قیمت انتالیس شلنگ سے ہرگز زائد نہیں ہے اور اس اعلان کو کسی نے بھی قابلِ مذمت نہیں سمجھا تھا۔ بہر حال قانون کا صرف واضح اور متعین ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اس کی کامرانی کے لیے اس کا مبنی بر انصاف ہونا بھی ضروری ہے۔

حلف کی اہمیت سچائی کے لازمۂ قانون و انصاف ہونے اور اس کی ضرورت مسلّم ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ دنیا بھر کی عدالتیں سچ بولنے پر اصرار کرتی ہیں اور ہر گواہ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ سچ بولنے کی قسم اٹھائے۔ قانون کے نقطۂ نظر سے مذہبی تصورات و اعتقادات کی اہمیت کی اس سے زیادہ واضح مثال ہمارے قانونی نظام میں مشکل سے ملے گی۔ گویا ہمارے قانون کا بنیادی مفروضہ اور نقطۂ آغاز یہ ہے کہ ہر شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے اور وہ خدا اور ایمان کا نام لے کر جھوٹ نہیں بولے گا۔ عدالتوں کے قیام پر صدیاں گزر چکی ہیں، لیکن آج بھی جو شخص گواہ کے

کٹہرے کے سامنے آتا ہے اُسے سب سے پہلے حلف اُٹھانا پڑتا ہے۔ اس فعل کے تقدس کے پیش نظر عدالت میں ایک خاموش فضا پیدا کی جاتی ہے۔ گواہ اپنے ہاتھ میں مقدس کتاب لیتا ہے اور یہ الفاظ کہتا ہے: "میں خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں سچی گواہی دونگا۔ میں سچائی، مکمل سچائی پیش کرونگا اور سچائی کے سوا کچھ پیش نہیں کروں گا۔" گواہ کے ہاتھ میں جو مقدس کتاب دی جاتی ہے وہ انجیل (NEW TESTAMENT) ہوتی ہے الا یہ کہ گواہ کسی دوسری کتاب کا مطالبہ کرے۔ جس وقت گواہ یہ قسم اُٹھاتا ہے تو وہ صرف جج ہی کو یہ باور نہیں کرا رہا ہوتا کہ وہ سچ بول رہا ہے بلکہ وہ اپنے خدا کے سامنے یہ پختہ عہد باندھ رہا ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ "مقدس فریب" اور "جزوی صداقت" HALF TRUTH خدا کے ہاں کسی کام کی نہیں ہے۔

ایک عامی سے عامی اور جاہل سے جاہل آدمی بھی جب کٹہرے میں آتا ہے تو اسے اس حقیقت کا اچھی طرح احساس ہوتا ہے۔ ویسٹرن سرکٹ کی ایک عدالت میں اس واقعہ کا باقاعدہ ریکارڈ موجود ہے کہ ایک گواہ نے قسم سے پہلے معمول کے مطابق کلمات دُھرانے کے بعد یہ بھی کہا تھا کہ "اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا میری جان یہیں قبض کرلے۔" چنانچہ وہ شخص وہیں دھڑام سے گرا اور گر کر اُس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس جگہ پر اُس وقت ایک پتھر نصب کر دیا گیا تھا جو اب تک اس واقعہ کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ اگر گواہ کسی ایسے مذہب یا عقیدے کا پیرو ہو جس کے لحاظ سے قسم کی کوئی دوسری شکل مناسب ہو تو عدالت میں اسی کو اختیار کیا جاتا ہے۔ گواہ کو بہرحال ایسی قسم اُٹھانی پڑتی ہے جو اُسے اپنے ضمیر و اخلاق کے مطابق سچ بولنے کے لیے پابند کر دیتی ہو۔

اس بحث سے آپ کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ قانون کا منشا اور تقاضا صرف اتنا ہے کہ محض عدالت میں قسم کھا کر سچ بولنا ضروری ہے اور دوسرے مواقع پر جھوٹ بولنے میں ہرج نہیں ہے۔ نہیں! ہرگز نہیں!! ہر انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جب بھی کسی دوسرے انسان سے کوئی معاملہ کرے تو اس میں حق و صداقت کی روش پر کاربند رہے۔ قانون جتنا اس معاملے میں سخت گیر اور متشدد ہے، اتنا کسی دوسرے میں نہیں ہے۔ وہ کسی پس و پیش اور ہیرا پھیری (EVASION) کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر ایک بیان محض الفاظ کی حد تک صحیح ہو لیکن اس میں سے کسی ایسے حصے کو قصداً حذف کر دیا گیا ہو، جس کی وجہ سے

غلط تاثر پیدا ہوتا ہو، تو ایسا بیان ایک "فریب" ہے۔ جیسا کہ لارڈ کلسینٹ (LORD KYLSANT) کو ایک مرتبہ خسارہ اٹھانے کے بعد اس تلخ حقیقت کا علم ہوا تھا۔ انہوں نے کیا یہ تھا کہ ایک کمپنی کے منافع جات کے اعداد و شمار تو انہوں نے شائع کر دیئے مگر نقصانات کے اعداد شائع نہیں کیے۔ اس سے کمپنی کی مالی حیثیت کا بہت غلط اندازہ ہوتا تھا۔ لارڈ موصوف کو اس کے نتیجے میں ایک سال جیل کی ہوا کھانی پڑی غلط بیانی اور فریب دہی وغیرہ کے بارے میں ہمارے ہاں جتنے بھی قوانین نافذ ہیں ان کا اصل الاصول یہ ہے کہ کسی آدمی کو کذب بیانی سے کسی طرح کا فائدہ اُٹھانے کی اجازت نہ دی جائے گی بشرطیکہ قانون میں کچھ بھی گنجائش ہو۔ کسی عذر یا تاویل کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ کسی نیک مقصد کے لیے بھی جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں ہے۔ پاکیزہ مقصد کے لیے ذریعہ بھی پاکیزہ ہونا چاہیے۔" اس معاملے میں ہمارا قانون تو بلاشبہ بہت مضبوط اور معقول ہے مگر میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ قانون تنہا کافی نہیں ہے۔ اگر لوگوں کے اندر مذہب کی سچی روح مفقود ہو تو محض قانونی ضمانات بالکل بے کار اور لاطائل ہیں۔ کیا دیانت و امانت کے آج کل ناپید ہونے کی اصل وجہ الحاد و بے دینی نہیں ہے؟ بیشتر گواہ جو ہمارے سامنے پیش ہوتے ہیں وہ حلف کی تقدیس کا کچھ بھی لحاظ نہیں رکھتے اور ایسا بیان دیتے ہیں جو اُن کے خیال میں اُن کے مقدمے کے لیے مفید ہو، خواہ وہ سچ ہو یا جھوٹ ہو۔

ایفائے عہد وعدے کو پورا کرنا بھی سچ بولنے سے کچھ کم اہم نہیں ہے۔ زبور کے الفاظ میں "کھرا آدمی صرف وہی نہیں ہے جو زبان کو جھوٹ سے آلودہ نہ کرے بلکہ وہ ہے جو ہمسائے سے وعدہ کر کے اُسے مایوس نہ کرے خواہ اُسے خود تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔" اس اصول کو ہمارے قانون میں بڑا دخل ہے۔ ہمارا قانون معاہدات مختلف مراحل میں سے گزرتا رہا ہے۔ ایک وقت وہ تھا جبکہ صرف قانونی دستاویز پر لکھا ہوا اور مُہر شدہ معاہدہ قابلِ وثوق سمجھا جاتا تھا۔ ایک وقت وہ تھا جبکہ صرف وہ معاہدہ لازم قرار دیا جاتا تھا جس کے عوض میں کچھ مالی لین دین عمل میں لایا جاتا تھا لیکن موجودہ زمانے میں ان تکلفات و رسوم کو ساقط کر دیا گیا ہے۔ آج کل اگر ایک انسان ایسا وعدہ کرتا ہے جس کی پابندی لازمی قرار دی جائے اور جس کی بنا پر دوسرا فریق کوئی کارروائی کرتا ہے، تو اب اس کارروائی کے وقوع میں آجانے کے بعد اُس وعدے کی

پابندی از روئے قانون واجب ہو جاتی ہے۔

مطبوعہ معاہدات | معاہدات کی حفاظت کے لیے ہمارے قانون کا مستعد ہونا بڑی خوش آئند بات ہے۔ لیکن بعض حالات میں یہ قانونیت حد سے تجاوز کر جاتی ہے۔ اس تجاوز کی سب سے واضح مثال ہمارے قانون کا وہ رویہ ہے جو اس نے مطبوعہ اور لگے بندھے معاہدات (STANDARDISED CONTRACTS) کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے۔ انشورنس کمپنیاں، بنک اور دوسرے تجارتی اور صنعتی ادارے معاہدے کے چھپے چھپائے فارم تیار رکھتے ہیں جن میں بے شمار شرائط درج ہوتی ہیں۔ ایک عام آدمی کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ یا تو ان ساری شرائط پر دستخط کرے یا پھر ان اداروں سے کوئی معاملہ ہی نہ کرے۔ ان پر دستخط کرنے والے افراد بالعموم اول تو ان ساری شرائط کو پڑھتے نہیں اور اگر پڑھ بھی لیں تو سمجھتے نہیں۔ لیکن دستخط کرنے کے بعد ایک شخص ان شرائط کے ساتھ ایسا بندھ جاتا ہے گویا کہ اُس نے ان میں سے ایک ایک شرط کو عمداً پورے شعور کے ساتھ قبول کیا ہے۔ پھر جب ان شرائط کی تعبیر و تشریح کا مرحلہ آتا ہے تو معاہدے کی لفظی پابندی پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اگر معاہدہ کرنے والا احتجاج کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "مجھے ایسی نادیدہ صورت حال کا پیشگی کچھ بھی علم و تصور نہ تھا" تو اُسے جواب دیا جاتا ہے کہ "یہ تمہارا اپنا قصور ہے، تمہیں ہوشیار اور خبردار رہنا چاہیے تھا"۔ لیکن میرے خیال میں یہ قانونی روش صحیح نہیں ہے اور مذہبی تعلیمات کی روشنی میں اس کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ اگر سینٹ ٹامس ایکوی ناس (ST. THOMAS ACQUINAS) ہوتے تو وہ یقیناً دستخط کرنے والے کو معذور قرار دیتے۔ فریقین میں سے ہر ایک کے اندر حُسنِ نیت (GOOD FAITH) کی موجودگی ضروری ہے۔ کسی ایک فریق کو اس کا موقع نہیں دیا جانا چاہیے کہ وہ بال کی کھال نکال کر الفاظ میں سے ایسا مفہوم برآمد کرے جو دوسرے فریق کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا ہو۔ قوانینِ ملکی کی تعبیر میں بھی ایسی دقتیں پیش آتی ہیں۔ بعض حالات میں منصفانہ قوانین کے الفاظ کو بھی ایسے معنی پہنا لیے جاتے ہیں جو قانون سازوں کے منشأ کے بالکل خلاف ہوتے ہیں اور جن سے انصاف کے تقاضے بُری طرح پامال ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں قانون بڑا غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کرتا ہے اور جج یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ "پارلیمنٹ کے پاس کردہ قوانین کے رخنوں کو پُر کرنا ہمارا کام نہیں ہے"۔

لفظی موشگافیاں میرا خیال یہ ہے کہ معاہدات اور قوانین کی تشریح میں اس قسم کی موشگافیاں سچائی کے بنیادی اور حقیقی تصور کے قطعاً منافی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان الفاظ پر حاکم ہونے کے بجائے ان کا محکوم بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر آپ انجیل پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ محض الفاظ کی غلامی کی کتنی مذمت کی گئی ہے۔ اس سلسلے کی نمایاں مثال وہ واقعہ ہے جو یوم سبت سے متعلق ہے۔ تورات کا چوتھا حکم یہ ہے کہ "سبت کے دن تو کوئی کام نہ کر" ایک مرتبہ حضرت مسیحؑ کے حواری گندم کے کھیت میں سے گزر رہے تھے اور ہفتے (سبت) کا دن تھا۔ انہوں نے خوشے توڑنے شروع کر دیے۔ فریسیوں نے کہا کہ "سبت کے دن یہ لوگ فعل حرام کا ارتکاب کیوں کر رہے ہیں"۔ حضرت مسیحؑ نے فرمایا "سبت انسان کے لیے بنایا گیا ہے نہ کہ انسان سبت کے لیے"۔ سینٹ پال نے اسی حقیقت کو ان جامع اور مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "الفاظ جان لیوا ہیں مگر معانی جان بخش ہیں"۔ کسی زمانے میں ہمارے انگریزی قانون میں اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بائیبل کا نیا نیا ترجمہ انگریزی میں ہوا تھا۔ ہمارے جج اسے پڑھا کرتے تھے اور ان کے فیصلے بلاشبہ اس سے اثر پذیر ہوا کرتے تھے۔ وہ قانون کی محض لفظی تعبیر پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ اس خرابی یا کمزوری کو بھی نگاہ میں رکھتے تھے جسے رفع کرنے کے لیے قانون بنایا گیا تھا۔ چنانچہ وہ قانون سازوں کے مقصود و مدعا (INTENTION) کو زندگی اور قوت بخشتے تھے۔ لیکن انیسویں صدی میں اس وسیع نقطۂ نظر کو ایک ایسے قاعدے میں بدل دیا گیا جو بیرن پارک کے الفاظ میں "زریں اصول" تھا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تمام قوانین و معاہدات کے الفاظ کی تعبیر لغت اور گرامر کی روشنی میں کی جانی چاہیے، خواہ اس کے نتیجے میں عدل، قانون اور قانون سازوں کا اصل مدعا بالکل فوت ہو جائے۔ میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جج بالکل آنکھیں بند کر لیں، ہاتھ باندھ لیں اور صورت حال کی ساری خرابی کا الزام مقننہ کے سر ڈال دیں۔ حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ الفاظ کی غلامی میں مبتلا ہوئے بغیر عبارت کی ایسی معقول توضیح و تاویل کی جانی چاہیے جو قرین عدل و انصاف ہو۔ حق اور صداقت تک رسائی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے

عدل و انصاف حق پرستی اور ایفائے عہد کے بعد آیئے اب عدل و انصاف کریں۔ میرے خیال میں اس امر سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کو ہمیشہ ہر معاملے میں عادلانہ اور منصفانہ رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ ہمارے

ہاں انصاف کا مفہوم بالکل وہی ہے جسے مسیحی تعلیمات میں "محبت" (LOVE) کا نام دیا گیا ہے۔ آرک بشپ آف کنٹربری ولیم ٹمپل کا بھی یہی خیال ہے اور میں انہیں موجودہ صدی کے عظیم ترین مفکرین میں شمار کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں "یہ امر مسلّم ہے کہ عیسائیت میں غالب اور امتیازی عنصر "محبت" ہوتا ہے اور اجتماعی تنظیمات میں محبت کا ظہور "عدل" کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو انجیل میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ کسی فقیہ نے حضرت مسیحؑ سے پوچھا "اے میرے آقا! حیاتِ ابدی کیسے نصیب ہوتی ہے؟" آپ نے جواب دیا "کتاب میں تم نے کیا پڑھا ہے؟" اس نے جواب دیا "لکھا ہے کہ تم اپنے خداوند خدا سے دل و جان سے محبت کرو اور اپنے ہمسائے سے ایسی محبت کرو جیسی تمہیں اپنے آپ سے ہے۔" حضرت مسیحؑ نے فرمایا "تم نے ٹھیک جواب دیا ہے۔ اس پر عمل کرو اور تم ہمیشہ زندہ رہو گے۔" خالق و مخلوق سے محبت کا یہ تصور بنیادی طور پر مذہبی تصور ہے اور زندگی کے اکثر معاملات میں اس کا عملی ظہور منصفانہ برتاؤ ہی کی شکل میں ہوتا ہے۔ آپ ایک مثال فرض کیجیئے کہ ٹریڈ یونین اور کارخانہ داروں کا جھگڑا چل رہا ہے اور کارخانے میں ہڑتال کا سخت خطرہ ہے۔ اب ٹریڈ یونین کمیٹی کو "محبت" کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ مگر وہ کس سے محبت کرے مزدوروں سے یا کارخانہ داروں سے۔ جواب یہ ہے کہ "دونوں سے"۔ آپ پھر یہ سوال کریں گے کہ عملاً اس جواب سے کچھ رہنمائی نہیں حاصل ہو رہی کہ کس طرح کی تجاویز مانی یا منوائی جانی چاہئیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کے معاملات میں باہمی محبت کا مطلب یہ ہے کہ دونوں سے انصاف برتا جاتے اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ ایک انتہائی غیر جانبدار ٹریبونل تشکیل کیا جائے جس پر دونوں فریقین کو پورا پورا اعتماد ہو۔ ہر فریق اس کے سامنے اپنا اپنا مقدمہ پورے زور اور دلائل کے ساتھ پیش کرے اور ہر فریق اس بات کا پختہ عزم کرلے کہ فیصلہ بلا چون و چرا شرح صدر کے ساتھ تسلیم کیا جائے گا۔ اس طرح سے دونوں کے ساتھ یکساں سطح پر انصاف ہوگا اور یہ ہمارے اُس مذہبی اصول کے بالکل مطابق ہوگا کہ "تو اپنے ہمسائے سے ویسی ہی محبت کر جیسی تو اپنے نفس سے کرتا ہے"۔[1]

عدالت کا فریضہ | فریقینِ تنازعہ کے بارے میں ہم نے دیکھ لیا کہ مذہب کی روشنی میں ان کا طرزِ عمل کیا ہو

[1] "عیسائیت اور نظامِ اجتماعی" (TEMPLE: CHRISTIANITY AND THE SOCIAL ORDER)

جس سے "محبت" کا تقاضا پورا ہو۔ آیئے اب دیکھیں کہ تنازعہ جس جج کے سامنے پیش ہو گا اُسے کیا کرنا چاہیے اُسے بھی انصاف سے کام لینا چاہیے۔ مگر اُسے کیسے معلوم ہو گا کہ انصاف کس شئے کا نام ہے! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ایک بہت بڑے جج نے اس مسئلے کو کیسے حل کیا ہے۔ ایک مرتبہ ایک شربت ساز نے ایسی لاپرواہی سے مشروبات کو تیار اور بند کرایا کہ ایک بوتل میں جیتا جاگتا گھونگا داخل کر دیا گیا۔ یہ بوتل اُس سے ایک دکاندار نے اور دکاندار سے ایک گاہک نے خریدی۔ گاہک کی بیوی نے اُسے پیا اور بیمار ہو گئی۔ پہلے زمانے میں ایسے معاملات کے بارے میں قانون کا فیصلہ یہ تھا کہ مال کا تیار کرنے والا ایسے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہے کیونکہ آخری خریدار کے ساتھ اُس کا براہِ راست کوئی لین دین کا معاملہ نہیں ہوا۔ لیکن ۱۹۳۲ء میں ہاؤس آف لارڈز نے یہ پاس کر دیا کہ صناع اس طرح کے نتائج کا ہر لحاظ سے ذمے دار ہے۔ اس کی بنا لارڈ ایٹکن (LORD ATKIN) کا وہ فیصلہ تھا جو مسیحیت کی تعلیمات کا صحیح مظہر تھا اور جس میں انہوں نے لکھا تھا "ہم ہمسائے سے محبت کے اصول کا انطباق قانون کی دنیا میں اس طرح کرتے ہیں کہ ہمسائے کو کوئی گزند نہیں پہنچانا چاہیے۔ آپ کو پوری اور معقول احتیاط برتنی چاہیے کہ آپ کوئی ایسا کام نہ کریں یا کرنے سے باز نہ رہیں، جس کے کرنے یا باز رہنے سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہو کہ آپ کے ہمسائے کو تکلیف پہنچے گی۔ اب وکیل پوچھتا ہے کہ قانون کی نگاہ میں ہمسایہ کون ہے۔ اس کا صحیح جواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمسائے وہ لوگ ہیں جو میرے فعل سے براہِ راست متاثر ہوتے ہیں اور اتنے قریب سے متاثر ہوتے ہیں کہ فعل کے صدور کے وقت ان لوگوں کے متاثر ہونے کا امکان بجا طور پر میرے ذہن میں موجود ہونا چاہیے۔ میں آپ سے عرض کروں گا کہ یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ ہمارے ہاں کا ایک بہت بڑا جج قانون کے اصول کو۔ نہیں، بلکہ انصاف کے اصول کو دینی تعلیمات سے اخذ کرے۔ مَیں نہیں جانتا کہ ایک جج اگر اس مأخذ اور سرچشمے کی طرف رجوع نہ کرے تو پھر اور کہاں جائے۔ بعض لوگ فطری انصاف (NATURAL JUSTICE) کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں گویا کہ یہ ایک ایسی شے ہے جسے ہر شخص آپ سے آپ جانتا ہے خواہ اُسکی پرورش اور تربیت کیسے ہی ماحول میں کیوں نہ ہوئی ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہمارے اندر انصاف اور سارے اخلاقِ حسنہ کے تصورات کا نشوونما ایک لمبے تاریخی پس منظر کے تحت ہوا ہے۔ انگلستان کے قانونِ عامّہ

(COMMON LAW) کو صدیوں کے تدریجی عمل کے بعد اُن ججوں نے اپنے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہے جن کی تعلیم و تربیت عیسائیت کے مذہبی ماحول میں سرانجام پاتی رہی تھی۔ عدل و انصاف کے مقتضیات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ ہمیشہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے مذہب سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

جرائم کا سدِباب | اب آپ دیکھیے کہ جرائم کی روک تھام کے لیے کس طرح مذہب اور قانون دونوں مل کر کام کرتے ہیں۔ یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے اور مذہب بھی ہمیں یہی بتاتا ہے کہ معاشرہ بہت حد تک وہ حالات پیدا کرتا ہے جو جرائم کے ارتکاب کا باعث بنتے ہیں۔ ہمارے ہاں گھریلو زندگی کا شیرازہ بالکل بکھر چکا ہے اکثر کم سن اور نابالغ مجرمین اُجڑے ہوئے گھرانوں (BROKEN HOMES) میں سے نمودار ہو رہے ہیں ایک نوعمر انسان جب اپنے گردوپیش کے ماحول میں اپنے لیے کوئی ماوی و ملجا نہیں پاتا تو وہ اس بے رحم دنیا سے لڑنے کا عزم کر لیتا ہے۔ اُس کے اندر لازماً اجتماعیت کُش اور مجرمانہ ذہنیت پرورش پانے لگ جاتی ہے۔ یہ برباد اور ویران گھرانے۔ جو کثیر تعداد میں مُجرمین فراہم کرتے ہیں، ہمارے اُس معاشرہ کے دامن پر ایک بدنما داغ ہیں جو رشتۂ ازدواج کا احترام کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا ہے، جو اپنے اخلاقی اقدار و معیارات کو خیرباد کہہ رہا ہے اور جو اپنے مذہب سے قطع تعلق کر رہا ہے۔ معاشرے کی اصلاح کیے بغیر محض مجرموں کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا مرض کو چھوڑ کر مرض کے علامات کے پیچھے پڑنا ہے۔ ہم مرض کو جڑ سے اکھیڑنے کی کوئی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے لیے پوری سوسائٹی کی اصلاح لابدی ہے اور اس ضمن میں مذہبی اور اخلاقی مصلحین اور رہنماؤں کی ذمہ داری بہت کٹھن ہے۔ یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے سب سے اُونچے گھرانوں میں خانگی ناچاقیوں اور ازدواجی جرائم کی مثالیں روز افزوں ہیں۔

فرد کی ذمہ داری | جرائم کی ذمہ داری اگرچہ معاشرے پر بھی عائد ہوتی ہے، لیکن نہ تو قانون کی نگاہ میں اور نہ ہی مذہب کی نگاہ میں فرد کو بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ عیسائیت کی رو سے ایک فرد بھی اپنے گناہوں کا بہت حد تک ذمہ دار ہے۔ عیسائیت ایک خطاکار کو یہ کہہ کر معاف نہیں کر دیتی کہ "جاؤ تمہارے کنبے یا تمہارے ماحول نے ایسا کرنے پر تمہیں مجبور کر دیا تھا۔" اُس سے یہ کہنا تو اُسے یہ اطمینان دلانا ہے کہ بُرائی کی روک تھام اور اُس کے خلاف انفرادی جدوجہد بالکل غیر ممکن اور غیر ضروری ہے۔ عیسائیت کا نقطۂ نظر اس سے

بالکل مختلف ہے۔ وہ مجرم سے تائب و نادم ہونے اور آئندہ اصلاح کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہماری دعا کی کتاب (BOOK OF COMMON PRAYER) کا اولین فقرہ یہ ہے: "جب گناہ گار اپنے گناہ سے باز آجاتا ہے اور نیکی کا کام کرتا ہے تو وہ اپنی روح کی زندگی اور سلامتی کو محفوظ کر لیتا ہے"۔ سینٹ لیوک (ST. LUKE) نے فرمایا ہے "جب خدا ایک پشیمان خطا کار کو اپنے حضور میں دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے"۔ ایک سزاوار مجرم کے اندر خباثتِ نفس (GUILTY MIND) کے احساس کا پیدا ہونا نہایت ضروری ہے۔ سینٹ آگسٹائن کے بقول اس احساس کے بغیر تطہیر ممکن ہی نہیں ہے۔ ہنری اول کے عہد میں تو اس بات کو بطور ایک قانونی دفعہ کے ثبت کیا گیا تھا کہ "جرم وہ ہے جس پر ضمیر ملامت کرے"۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو آج بھی قانونی جرائم کی بنیاد یہی نظریہ ہے کہ جو فعل اخلاقی لحاظ سے قابلِ مذمت ہے قانونی لحاظ سے وہی مستوجبِ سزا و عقوبت ہے۔ گویا ایک فعل کے "جرم" ہونے کے لیے اس کا "گناہ" ہونا ضروری ہے۔

فرد اور جماعت اسی بحث کے دوران میں یہ بنیادی سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ فرد اور جماعت — شہری اور ریاست — کے باہمی تعلقات و حقوق کی تعیین کس طرح سے ہو۔ حق اور انصاف کوئی مجرد تصورات نہیں ہیں کہ ایک فکری خلا کے اندر اُن کا تصور کیا جا سکتا ہے، ان کا عملی مظاہرہ ایک جماعت یا دوسرے لفظوں میں ریاست کے وجود کے تحت ہی ہوتا ہے۔ اب ریاست اور معاشرے کو ایسی بنیادوں پر بھی استوار کیا جا سکتا ہے جہاں حق اور عدل کا گلا بالکل گھونٹ دیا جائے اور صرف اس کا ذکرِ خیر ہی باقی رہ جائے۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے پھر مذہب کی طرف لوٹنا ضروری ہے۔ مذہب کا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے میں پھر ولیم ٹمپل کے الفاظ مستعار لوں گا۔ وہ فرماتے ہیں "مسیحی اخلاقیات اور مسیحی سیاست کا ابتدائی اصول یہ ہے کہ ہر فرد بحیثیت فرد کے انفرادی اعزاز و احترام کا مستحق ہے۔ اگر ہر مرد اور ہر عورت خدا کی مخلوق ہے جس سے خدا محبت کرتا ہے تو معاشرے کے حق میں ایک فرد کی افادیت سے قطع نظر ہر فرد کی ایک مستقل بالذات شخصی قدر و قیمت ہے۔ فرد کا درجہ اولین ہے اور جماعت کا درجہ ثانوی۔ ریاست شہری کے لیے ہے نہ کہ شہری ریاست کے لیے"۔ عیسائیت نے ہمیشہ اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ

ریاست کو کلی، آخری اور مطلق اقتدار حاصل نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اقتدار کو اللہ تعالیٰ سے اخذ کرتی ہے۔ سینٹ پال نے رومیوں کو جو مکتوب روانہ کیا تھا اس میں صاف لکھا تھا کہ "اقتدار کسی کو حاصل نہیں سوائے اللہ کے۔ تمام حکمران خدا کے محکوم ہیں۔" یہی تو وہ سپر ہے جس سے مسلح ہو کر ہمارے آباؤ اجداد نے ظلم و استبداد کا مقابلہ کیا تھا۔ سینٹ پال نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "ریاست تو نیکی کے قیام میں خدا کی نائب ہے" (MNISTER OF GOOD FOR GOOD)۔ جب تک ریاست اپنی مقدس امانت کو ادا کر رہی ہے اُس کی مزاحمت جائز نہیں لیکن جب وہ حد سے تجاوز کر کے اقتدارِ مطلق (ABSOLUTE POWER) کی مدعی بنتی ہے تو اُس کی مزاحمت حق بجانب ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جن آدمیوں میں جبلّی طور پر جنسی یا بعض دوسرے وحشیانہ جرائم کے ارتکاب کا میلان ہو انہیں یا بانجھ بنا دینا چاہیے یا غیر محدود عرصے کے لیے اُنہیں محبوس کر دینا چاہیے یا قتل کر دینا چاہیے۔ لیکن ہمارے ملک میں کسی شہری سے یہ سلوک روا رکھنے کی قانوناً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی مذہبی تعلیمات کا ثمرہ ہے۔ مذہب کی رُو سے آزادی، زندگی، اور زندگی کو وجود میں لانے والے توالد و تناسل کے ذرائع سب مقدس و محترم ہیں۔ یہ خدا کا عطیہ ہیں اور وہی انہیں ہمیشہ کے لیے واپس لے سکتا ہے۔ اگر ریاست کو ان عطیات پر ہاتھ ڈالنے کی کھلی چھوٹ دے دی جائے تو وہی کچھ ہو گا جو نازی ریاستوں نے کیا، یعنی انہوں نے اپنے سیاسی مخالفین پر یہ حربے آزمانے شروع کر دیے۔ میرے ذہن میں اس مسئلے کا کوئی حل سوائے اس کے نہیں ہے کہ ہم مذہب سے رجوع کریں۔ وہی ہمیں بتائے گا کہ شہری اور ریاست کے حقوق میں توازن کی معتدل صورت کونسی ہے۔

ایک تاریخی واقعہ | جیمز اول (JAMES 1) کے عہد میں ایک مشہور و معروف واقعہ پیش آیا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ وہ ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح انگلستان میں حکومت کر سکتا ہے اور عدالتوں میں استغاثہ و مرافعہ کے بغیر وہ ہر معاملے میں آخری فیصلہ دے سکتا ہے۔ آرک بشپ بین کرافٹ (BANCROFT) نے بھی بادشاہ کی تائید کی۔ لیکن اُس زمانے میں ایک بہت بڑے لارڈ چیف جسٹس تھے جن کا نام تھا لارڈ کوک (LORD COKE) وہ اپنے دن کا ایک چوتھائی حصہ عبادت میں بسر کیا کرتے تھے (اور ان کی کثیر

مصروفیتوں کے ساتھ تعجب ہوتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ کیسے کر لیتے تھے)۔ انہوں نے بادشاہ سے کہا "تمہیں فیصلے چکانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تمام مقدمات عدالت میں جانے چاہئیں"۔ بادشاہ نے کہا "میں نے تو یہ سُن رکھا ہے کہ تمہارے قوانین کی بنا عقل پر رکھی گئی ہے، تو کیا مجھ میں ججوں سے بھی کم تر عقل ہے؟" چیف جسٹس نے جواب دیا "آپ بلاشبہ بہت علم و صلاحیت کے مالک ہیں لیکن قانون کے لیے بڑے تجربے اور مطالعے کی ضرورت ہے۔ یہ تو ایک سنہری پیمانہ ہے جس سے رعایا کے حقوق کی پیمائش کی جاتی ہے اور خود حضور والا کی حفاظت کی جاتی ہے"۔ بادشاہ نے انتہائی غضبناک ہو کر کہا "کیا میں بھی قانون کے ماتحت ہوں، ایسا کہنا تو غداری ہے"۔ لارڈ کوک نے برکٹین کا حوالہ دیتے ہوئے کہا "بادشاہ کسی آدمی کا محکوم نہیں، مگر وہ خدا اور قانون کا محکوم ہے"۔

دستور کا سنگِ بنیاد | برکٹین (BRACTON) کے جو الفاظ ہمارے قاضی القضاۃ لارڈ کوک نے نقل کیے تھے۔ یہ درحقیقت ہمارے دستور کا سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ ہیں۔ "خدا اور قانون سے بادشاہ کے بالاتر نہ ہونے" کا مطلب یہ ہے کہ انتظامیہ (EXECUTIVE) قانون کے ماتحت ہے۔ ہمارے قانون دان جب یہ دستوری کلیہ بیان کرتے تھے تو وہ دراصل اپنا ایک مذہبی عقیدہ دہرا رہے ہوتے تھے۔ اگر ہم اس عقیدے کو فراموش کر بیٹھیں تو ہمارا انجام کیا ہوگا اور اس خود فراموشی کی زد کہاں کہاں جا کر پڑے گی۔ اس کے دُور رس نتائج و عواقب کا مشاہدہ کرنے کے لیے آپ ایک نظر اٹھا کر دنیا کی آمرانہ ریاستوں کو دیکھ لیں۔ وہاں ریاست کو فرد پر مقدم قرار دے کر فرد کے وجود کو ریاست میں گم کر دیا گیا ہے۔ وہاں شہری ریاست کے لیے زندہ ہے نہ کہ ریاست شہری کے لیے۔ وہاں کے حکمران "خدا اور قانون کے تابع" نہیں ہیں۔ وہ خود ہی خدا اور خود ہی قانون ہیں۔ تمام قوانین اور تمام عدالتیں انتظامی مشینری کے ہی کل پرزے ہیں۔ ان کا کوئی مستقل اور آزادانہ وجود نہیں ہے۔ فرد کی آزادی کی حقیقت خواب و خیال سے بھی کم تر ہے۔ ایسی ہولناک مطلق العنانی اور استبداد کے خلاف، اور حیاتِ انسانی پر ایسے مہیب آہنی تسلط کے خلاف، ہمارا مذہب پورے زور اور پوری قوت کے ساتھ احتجاج کرتا ہے!

اب میں اپنی بحث کو ختم کرتا ہوں۔ آپ خود دیکھ لیجیے کہ بحث کسی نتیجے پر پہنچ کر ختم ہو رہی ہے۔ بلاشبہ آخری نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم حق اور عدل کے متلاشی ہیں تو ہم اسے بحث مباحثوں اور مناظروں کے ذریعے سے، مطالعے اور غور و فکر کے ذریعے سے دریافت نہیں کر سکتے۔ صداقت اور انصاف تک رسائی نیکوکاری اور بندگی

(باقی صفحہ آئندہ کے نیچے)

(بقیہ مذہب اور قانون کا باہمی رشتہ)

کی وساطت ہی سے ہو سکتی ہے۔ سچائی اور انصاف کی پہچان روح کو ہے اور روح کو زندگی اور جلا مذہب کے طفیل ہی ملتی ہے۔ قانون تو سچائی اور انصاف کو نافذ اور منطبق کرنے کا محض ایک ناقص اور ادھورا وسیلہ ہے جس کا ظہور صرف خارجی لین دین اور ظاہر کے معاملات میں ہوتا ہے۔ جس دن روئے زمین پر سے مذہب کا خاتمہ ہو جائے گا، اسی دن زمین پر سے سچائی اور عدل کا بھی جنازہ اٹھ جائے گا۔ اپنے آبا و اجداد کے مذہب سے دور ہوئے اور دور رہے ہم پر مدتہائے دراز گذر چکی ہیں۔ آئیے ہم اس کی طرف لوٹیں کیونکہ یہی اور صرف یہی ایک شے ہے جو ہمیں بچا سکتی ہے !!!